سید صباح الدین عبدالرحمن سے ایک انٹرویو ★

ممتاز لیاقت

- ★ مغربی جمہوریت اور اسلام
- ★ بادشاہت اور قرآن
- ★ پاکستان بھارتی مسلمانوں کی نظر میں

س : مولانا! کچھ دار المصنفین کے تاریخی وعلمی پس منظر کے بارے میں فرمائیے کہ پاکستان میں اکثریت اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی ۔

ج : دار المصنفین اعظم گڑھ کا علمی پس منظر مختصر الفاظ میں اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ مولانا شبلی نعمانیؒ کا خیال تھا کہ برصغیر ہندوستان کے اندر ایک ایسا ,,گوشۂ عافیت ،، ہونا چاہیئے جہاں ارباب علم شہروں کے ہنگاموں سے دور اور تمام غیر ضروری تفریحات سے بے نیاز ہوکر صرف اور صرف علمی کاموں میں مصروف رہیں ۔ شروع میں وہ اس ,, گوشہ عافیت،، کو ندوۃ العلماء لکھنو کے قریب کہیں بسانا چاہتے تھے مگر بعدازاں انھوں نے اس کے لئے اپنے وطن اعظم گڑھ کو پسند کیا اور اپنا بارہ ایکڑ رقبہ پر پھیلا ہوا باغ دار المصنفین کے لئے وقف کر دیا ۔ اس منصوبے کا تفصیلی خاکہ تیار

★ مئی ۱۹۸۴ء میں سید صباح الدین عبدالرحمن پاکستان کے دورے پر تشریف لائے ۔ ان دنوں ادارہ تحقیقات اسلامی کے شعبہ مطبوعات کے نگران جناب ممتاز لیاقت صاحب نے ان سے یہ انٹرویو لیا جو بعد ازاں اسلام آباد کے ہفت روزہ حرمت کے شمارہ ۲۲ جلد ۳ ۔ ۱۵ تا ۲۲ مئی ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا گیا جو سب سے پہلے مولانا ابو الکلام آزاد نے ,, الہلال ،، میں شائع کیا ۔ اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے میں سب سے بڑی رکاوٹ سرمایہ کی کمی تھی ۔ مولانا کے پاس اس منصوبے کے لئے بارہ ایکڑ کا صرف باغ تھا یا پھر ان کی ذات گرامی ۔ جس میں ایک دنیا سمٹی ہوئی تھی مگر سرمایہ نہ تھا تاہم انھیں اپنے شاگردوں پر بڑا بھروسہ تھا ۔ انھیں اعتماد تھا کہ جیسے ھی ادارہ قائم ھوا ان کے شاگردوں کی ایک اچھی خاصی جماعت ان سے آملے گی، جو اس مشن میں ہر طرح ان کی معاون و مددگار ھوگی ۔ ان دنوں مولانا مرحوم سیرت النبیؐ لکھ رہے تھے لیکن ابھی خاکے میں رنگ ھی بھر پائے تھے اور کام کا آغاز ھی ھوا تھا کہ مرض الموت میں مبتلا ھو گئے بستر مرگ پر ان کی بس اتنی تمنا تھی کہ سیرت النبیؐ مکمل ھو جائے اور دار المصنفین وجود میں آ جائے ۔ مرض نے شدت اختیار کی تو انھوں نے اپنے شاگردوں مولانا آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی کو تار دے کر طلب کیا ۔ مولانا آزاد تو پہنچ نہ سکے لیکن مولانا سید سلیمان ندوی جو کہ ان دنوں پونا کالج میں استاد تھے ، تار پاتے ھی استاد کی خدمت میں روانہ ھوگئے، وہ اس وقت پہنچے جب مولانا شبلی پر عالم نزع طاری تھا، مولانا شبلی نے انھیں دیکھا اور صرف اتنا کہہ سکے ,, سیرت، سیرت، سیرت ،، (یعنی سیرت النبیؐ کو تمھیں مکمل کرنا ہے) اور واصل بحق ھو گئے ۔ اس منظر سے مولانا سلیمان ندوی بے حد متأثر ھوئے اور انھوں نے اسی وقت ارادہ کر لیا کہ اپنے استاد کے منصوبہ ,, سیرۃ النبیؐ ،، کو پایہ تکمیل تک پہنچائیں گے اور دار المصنفین بھی قائم کریں گے چنانچہ انھوں نے اس منصوبے پر اسی روز سے کام شروع کر دیا مولانا شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین بھی اس میں ان کے معاون بنے ۔ دار المصنفین کا دستور بننے لگا تو مولانا آزاد بھی اس کام میں شریک ھو گئے اور اس

منصوبے کا ایک خاکہ بھی بنا کر بھیجا ۔ مگر اس وقت بھی سب سے بڑا مسئلہ سرمایہ کی فراھمی تھا ۔ چنانچہ کوشش کی گئی کہ مولانا شبلی مرحوم کو حیدر آباد سے جو وظیفہ ملا کرتا تھا وہ ، دارالمصنفین کے نام منتقل کروایا جائے ۔ وظیفہ کی رقم ۳۵۰ روپے ماھانہ تھی ان دنوں نظام حیدر آباد کے وزیر اعظم عماد الملک سید حسین بلگرامی تھے وہ مولانا شبلی کے پرستار و مداح تھے ۔ ان کی مساعیٔ جمیلہ سے یہ رقم دار المصنفین کے نام منتقل ھو گئی ۔

مولانا شبلی کے شاگردوں میں سے ایک مسعود علی ندوی تھے جو بڑے عملی آدمی تھے ۔ وہ بھی مولانا شبلی کی وفات کے وقت پہنچ گئے تھے ۔ مولانا مرحوم کے ایک عزیز شاگرد مولانا عبدالسلام ندوی ان دنوں مولانا آزاد کے ساتھ الھلال میں کام کر رہے تھے، وہ بھی آگئے ۔ مولانا مرحوم کا انتقال نومبر ۱۹۱۴ء میں ھوا اور چند ھی ماہ بعد یعنی ۱۹۱۵ء میں مولانا مرحوم کے ایثار پیشہ شاگردوں کی چھوٹی سی جماعت دار المصنفین قائم کرنے میں کامیاب ھو گئی اور انھوں نے صرف قوت لایموت کیلئے ضروری وظیفہ لے کر کام شروع کر دیا ۔ یہ وظیفہ ۲۵ سے ۶۰ روپے تک تھا ۔ مولانا شبلی مرحوم اپنا کتب خانہ بہت پہلے ندوۃ العلماء لکھنو کو عطیہ کر چکے تھے ۔ چنانچہ سب سے پہلے دار المصنفین کے علمی کاموں کیلئے ایک کتب خانہ جمع کیا گیا ۔ اس ادارہ کی نمایاں خصوصیت یہ طے پائی کہ یہاں کام کرنے والے ایک ھی احاطہ میں رھیں تاکہ اسکالر چوبیس گھنٹے کام کر سکیں ۔ نیز ان کا مطبع اور دار الاشاعت بھی اپنا ھو ۔ خداوند کریم کے فضل و کرم سے تھوڑے ھی عرصہ میں سب چیزیں مہیا ھو گئیں اور ۱۹۱۸ء سےدارالمصنفین کا ترجمان ,,معارف،، کے نام سے شائع ھونے لگا ۔ الحمد للہ کہ اُس وقت سے ابتک ,, معارف ،، برابر چل رھا ہے اور ھر مہینے کی ۱۵ تاریخ کو چھپ جاتا ہے ۔ مگر سب

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے زیادہ اھمیت اور اولیت سیرۃ النبی کو دی گئی ـ مولانا شبلی نے سیرۃ پاک کا صرف مسودہ چھوڑا تھا، مولانا سید سلیمان ندوی نے اسے مرتب کرنا شروع کیا بعد ازاں اس کی ضخامت کے پیش نظر اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا اور جہاں اضافہ کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی مولانا نے اس میں اضافہ کیا لیکن وہ خطوط وحدانی کے اندر، تاکہ امتیاز کیا جا سکے کہ یہ مولانا ندوی کا اضافہ ہے ـ

اسی ضمن میں صحابہ کرامؓ کے حالات و سوانح پر بھی کام شروع کیا گیا ـ الحمد اللہ اس سلسلے کی بارہ جلدیں چھپ چکی ھیں ، جب کہ تابعین پر بھی ایک جلد اور تبع تابعین پر دو جلدیں آ چکی ھیں ـ نیز حکمائے اسلام پر بھی دو جلدیں لکھی گئی ھیں ـ مولانا سید سلیمان ندوی کی ارض القرآن دو جلدوں میں شائع ہوئی ـ اس کے علاوہ ,, سیرت عائشہؓ ،، ,, خیام ،، اور ,, عرب و ھند کے تعلقات ،، نے قبولیت عام حاصل کی ـ مختصر یہ کہ اب تک تقریباً دو سو کتابیں چھپ چکی ھیں ـ جن میں سے بارہ جلدیں تاریخ اسلام اور اٹھائیس جلدیں تاریخ ھند پر ھیں ـ ادبی تصانیف میں ,, شعر العجم ،، ,, شعر الھند ،، ,, اقبال کامل ،، نقوش سلیمانیؒ اور ,, غالب مدح و قدح کی روشنی میں ،، بہت مقبول ھیں ـ

دار المصنفین کے ترجمان ,, معارف ،، کے مضامین ، مذھبی ، تاریخی اور علمی ھوتے ھیں ـ ڈاکٹر اقبالؒ نے جب اسے پڑھا تو مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا ,, کہ اس کو پڑھ کر ایمان تازہ ھوتا ہے ،، اور بقول عبد المجید سالک کے ,, اس کی جلدیں انسائکلوپیڈیا آف اسلام کا کام دیتی ھیں کیونکہ اسلام کے ہر موضوع پر مضامین مل جاتے ھیں ،، ـ

دار المصنفین کی علمی سرگرمیوں کو منتہائے کمال تک پہنچانے میں مولانا سید سلیمان ندوی کی مساعی جمیلہ سر فہرست ھیں ـ

ان کے بارے میں ڈاکٹر اقبالؒ نے لکھا تھا کہ ,, وہ جوئے شیر اسلامیہ کے فرہاد اور استاد الکل ہیں،، اور خود مولانا سید سلیمان ندوی علامہ ڈاکٹر اقبال سے بے حد متأثر تھے اور ان کے بقول ,, علامہ اقبال کاروان ملت کے رجزخواں اور حدی خواں اور اسرار الٰہی کے محرم اور رموز شریعت کے آشنا اور مفکر اسلام بن کر شاعری کرتے رہے ،، ۔ وہ اکثر فرماتے تھے ,, اتنا بڑا مفکر اسلام میں صدیوں کے بعد پیدا ہوا ہے ،، ۔ مختصر یہ کہ دونوں کے باہم گھیرے تعلقات تھے ۔

س : مولانا ! دار المصنفین کے رفقاء کو کیا ھدیہ ملتا ہے اور اس کے مالی وسائل کیا ہیں ؟

ج : دار المصنفین کے رفقاء کا سب سے بڑا سرمایہ ان کا جذبۂ ایثار و خدمت ہے ۔ آج کل عملہ ۴۵ آدمیوں پر مشتمل ہے ان میں سے آٹھ نو کل وقتی اسکالر ہیں جو چوبیس گھنٹے دار المصنفین کے احاطہ میں رہتے ہیں ۔ ان میں میری ذات کے علاوہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی ، مولانا عبدالرحمن پرواز، مولانا عبید اللہ ندوی ، مولانا عمیر صدیقی ندوی ، مولانا ابو البقا ندوی اور مولانا محمد مبین ندوی وغیرہ شامل ہیں ۔ کچھ رفقاء اعزازی بھی ہیں ۔ جیسا کہ میں نے قبل ازیں کہا ہے، ان رفقاء کا اصل اثاثہ ایثار و قربانی ہے اور وہ صرف اتنا لیتے ہیں جو قوت لایموت کیلئے ضروری ہے ۔ مولانا سید سلیمان ندوی ۳۲ سال تک دار المصنفین میں رہے ان کی آخری تنخواہ ۲۵۰ روپے تھی ۔ ان کے جانشین مولانا معین الدین احمد ندوی نے ۵۱ سال تک دار المصنفین کی خدمت کی ۔ ان کی آخری تنخواہ ۳۶۰ روپے تھی ۔ ان کے عہد میں یہ خاکسار اس عظیم علمی ادارہ کا خدمت گزار بنا ۔ رفقائے کار کی تنخواہوں کا معیار آج بھی روز اول کا سا ہے اور اس ہوشربا گرانی کے دور میں بھی کسی کی تنخواہ ۱۲۰۰ روپے سے زیادہ نہیں ۔ جہاں تک دار المصنفین کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مادی وسائل کا تعلق ہے دار المصنفین کی آمدنی یا مالی امداد کا آغاز نظام حیدر آباد کے ۳۵۰ روپے ماہانہ کے اس وظیفہ سے ہوا تھا جو مولانا شبلی مرحوم کو دیا کرتے تھے ۔ پھر اس میں ۲۵۰ روپے ماہانہ اور اضافہ ہو گیا ۔ ریاست بھوپال سے بھی ۳۰۰ روپے ملنے لگے یہ سلسلہ ۱۹۴۷ء تک جاری رہا ۔ ریاستیں ختم ہوتے ہی یہ امداد بھی بند ہو گئی ۔ تاہم اس ادارے نے حکومت سے امداد لینا کبھی پسند نہیں کیا ۔ یہ ادارہ چونکہ روز اول ہی تحریک خلافت اور تحریک آزادی میں شامل ہو گیا تھا اور انگریزوں کی سامراجیت کو پسند نہیں کرتا تھا اس لئے ان کی حکومت سے امداد قبول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ۔ حالانکہ حکومت کی طرف سے اس ضمن میں کوشش بھی ہوئی ۔ مگر باوجودیکہ ادارہ انتہائی مشکلات کا شکار رہا اس نے اپنی اصول پسندی ، وضع داری ، قناعت اور صبر کی روایت کو ترک نہیں کیا ۔ قیام پاکستان سے قبل اس ادارہ کو زیادہ تر آمدنی مطبوعات کی فروخت سے ہوتی تھی اور اس خریداری کا سب سے بڑا مرکز وہ علاقہ تھا جو اب پاکستان میں ہے ، جب اس علاقے سے تجارتی لین دین بند ہوا تو ادارہ سخت مالی بحران کا شکار ہو گیا ۔ اور ایک ایسا زمانہ بھی آیا کہ جب یہ خیال پیدا ہوا کہ ادارہ باقی نہیں رہ سکے گا ۔ لیکن اللہ مسبب الاسباب ہے ۔

قیام پاکستان کے بعد مولانا ابو الکلام آزاد بھارت کے وزیر تعلیم ہوئے، وہ مولانا شبلی کے شاگرد اور دار المصنفین کے دستور سازوں میں سے تھے ۔ اس لئے ان کی خواہش تھی کہ اب جب کہ ہندوستان میں قومی حکومت قائم ہو چکی ہے ، ادارہ کو سرکاری امداد قبول کر لینی چاہیئے ، بذات خود جواہر لال نہرو ترک موالات کی تحریک میں دار المصنفین کے مہمان رہ چکے تھے بلکہ ان کے والد موتی لال نہرو اور گاندھی جی بھی دار المصنفین میں آ چکے تھے ۔

اس لئے سب کو حالات کا اندازہ تھا ، چنانچہ وزیر اعظم نہرو کی خواهش بھی یہی ہوئی کہ دار المصنفین کو باقاعدہ مالی امداد یا گرانٹ دی جانی چاهیئے ، لیکن ادارہ نے حکومت کی کوئی مالی امداد لینا پسند نہیں کیا ۔ البتہ اپنے مالی بحران کو دور کرنے کے لئے ٦٠ ہزار روپے کی امداد عارضی طور پر قبول کرلی ۔ یہ ۱۹۵۴ء کا قصہ ہے ۔ سرکار کی طرف سے اس امداد کا اعلان ہونا تھا کہ انتہا پسند ہندوؤں نے پارلیمنٹ میں ہنگامہ کر دیا ۔ جس کے جواب میں مولانا آزاد نے پارلیمنٹ میں ایک آتشیں اور تاریخی تقریر کی جس کا ان انتہا پسندوں سے کوئی جواب بن نہ آیا ۔ بہرحال ٦٠ ہزار روپے کی اس رقم کو ادارہ نے قبول کر لیا ۔ مگر یہ طے ہو گیا کہ آئندہ حکومت سے عارضی امداد لینے کے لئے بھی رجوع نہیں کیا جائے گا ۔

اس دوران میں پاکستانی ناشر اور تاجران کتب دار المصنفین کی کتابیں مسلسل چھاپ رہے تھے ۔ یہ سراسر غیر قانونی اور غیر اخلاقی حرکت تھی ۔ آخر حکومت پاکستان کو توجہ دلائی گئی کہ ,,اگر پاکستان هم کو مالی امداد نہیں دے سکتا تو مالی نقصان بھی نہ پہنچائے ،، ۔ مگر کوئی نتیجہ نہ نکلا اور ناشران و تاجران کتب نے ان کتابوں سے خوب پیسے بنائے ۔ دار المصنفین کو تو ان سے کیا ملنا تھا، ان سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ مولانا سید سلیمان ندوی کی بیوہ هی کی مالی اعانت کر دیتے کہ ۱۹۵۵ء میں مولانا کی وفات کے بعد انہوں نے ١٦ سال پاکستان کی سرزمین پر بلا دام و درهم محنت مزدوری کرکے اس عالم میں گزارے کہ دو لڑکوں اور تین لڑکیوں کی ذمہ داریاں بھی ان پر تھیں ۔ ١٩٦٩ء میں شیخ ممتاز حسن سے ایک ملاقات میں جب ان کا ذکر آیا تو وہ سخت پریشان اور نادم ہوئے ۔ اور آخر ان کی کوششوں سے انہیں ۳۵۰ روپے ماهانہ وظیفہ حکومت پاکستان کی طرف سے دیا گیا ۔ اب سنا ہے کچھ اضافہ ہو گیا ہے ۔ پاکستان کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پبلشر اپنی اس غیر اخلاقی و غیر قانونی حرکت سے باز نہ آئے تو حکومت پاکستان کے سامنے یہ تجویز پیش کی گئی کہ دار المصنفین کی مطبوعات کا حق طباعت و اشاعت خود حکومت پاکستان خرید لے اور اس کے بدلے دار المصنفین کو یکمشت ادائیگی کر دے ، تاکہ اس کی مالی مشکلات کا حل بھی نکل آئے ۔ اس تجویز کو آگے بڑھانے میں پاکستان کے اصحاب علم و فضل نے پوری پوری مدد بہم پہنچائی ۔ پاکستان کا پورا پریس اس تجویز کی تائید کرنے لگا ۔ اس کے لئے ہم ان سب کے بے حد شکر گذار ہیں ۔ بالآخر ۱۹۷۵ء میں حکومت پاکستان نے ۱۵ لاکھ روپے ادا کرکے دار المصنفین کی کتابوں کے حقوق طباعت و اشاعت برائے پاکستان، نیشنل بک فاؤنڈیشن کیلئے خرید لئے ۔ یہ رقم باضابطہ طور پر حکومت کے ذریعے دار المصنفین کو بھیج دی گئی ۔ اس کی اطلاع ہندوستانی سفارت خانے اور وزارت خارجہ کو دی گئی تو انھوں نے اس معاھدے پر خوشی کا اظہار کیا اور مجھے لکھا کہ اس سے دونوں ملکوں کے کچھ اور مسائل طے کرنے میں بھی مدد ملے گی ۔ قصہ مختصر یہ کہ اس رقم سے ھمیں اپنا مالی بحران دور کرنے میں بڑی مدد ملی ۔ تکلیف دہ امر یہ ہے کہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کو دار المصنفین کی ایک سو پندرہ مطبوعات کے حقوق طباعت و اشاعت دیئے گئے تھے مگر گذشتہ آٹھ سال میں فاؤنڈیشن ان میں سے صرف ۲۶ کتابیں چھاپ سکی ہے ۔ جبکہ نجی تاجران کتب کی طرف سے ,, مسروقہ ایڈیشنوں " کی طباعت و اشاعت کا سلسلہ اب بھی جاری ہے اور نیشنل بک فاؤنڈیشن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کر سکی ۔

دار المصنفین کا ایک اور ذریعہ آمدنی یہ رہا ہے کہ ہم ۱۵۰۰ سو روپے لے کر لائف ممبر بھی بناتے ہیں ۔ اس رقم میں سے ۷۵۰ روپے کی کتابیں تو لائف ممبر کو فوراً بھیج دیتے ہیں ۔ جبکہ ۷۵۰

روپے میں رسالہ معارف اور نئی مطبوعات باقاعدگی سے ملتی رہتی ھیں ۔ مگر اب ڈاک کے اخراجات بڑھ جانے کے باعث یہ ذریعہ بھی کچھ زیادہ مفید نہیں رہا ۔ پاکستان سے جو لوگ (اور ان کی تعداد بہت زیادہ ہے) لائف ممبر بننا چاھتے ھیں ان کی رقوم ھم تک پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں کیونکہ دونوں حکومتوں کے درمیان ایسا کوئی انتظام نہیں ہے۔

س : مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا آزاد دونوں ھی مولانا شبلی کے شاگرد تھے ؟ لیکن مولانا آزاد پر ان کی فکر کا اثر کوئی زیادہ نظر نہیں آتا ؟

ج : آپ کا خیال بالکل درست ہے کہ مولانا آزاد پر شبلی کی تحریروں کا اثر اتنا نہیں ھوا مگر اس میں شک نہیں کہ مولانا آزاد بھی مولانا شبلی کو بے حد عزیز تھے ۔ مولانا شبلی اکثر فرمایا کرتے تھے میں ایجاز (پھیلی ھوئی بات کو سمیٹنا) کا بادشاہ ھوں اور ابوالکلام اطناب کابادشاہ ہے» وہ مولانا آزاد کو اسی حیثیت سے پسند کرتے تھے کہ وہ سمٹی ھوئی باتوں کو پھیلا کر لکھنا اور بیان کرنا جانتے تھے ۔ مولانا شبلی آزاد کے زور بیان سے بھی متأثر رھے ۔ جہاں تک مولانا شبلی کے خیالات کا تعلق ہے ان سے بھی آزاد ایک حد تک ضرور متأثر ھوئے ۔ چنانچہ الھلال کے مضامین میں وھی ساری باتیں پائی جاتی ھیں جن کی ترویج مولانا شبلی کرتے رھے ۔ یہ اور بات ہے کہ مولانا آزاد کا میدان زیادہ تر سیاسی رھا ۔ اور ان کی سرگرمیاں اور صلاحیتیں سیاست میں صرف ھوتی رھیں ۔

س : بھارت کے لسانی مسئلہ پر کچھ فرمائیے ؟

ج : لسانی بالخصوص اردو زبان کا مسئلہ جنوبی بھارت میں خاصی پیچیدہ صورت اختیار کر گیا ہے ۔ اتر پردیش وغیرہ میں ۱۹۳۶ء ھی میں واردھا سکیم کے تحت ھندی کو اپنا لیا گیا تھا اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جب سے ھندی سرکاری و قومی زبان قرار پائی ہے مسلمان بچے برابر ھندی پڑھ رھے ھیں اور انھوں نے ھندی پڑھنے اور سیکھنے میں سبقت اس لئے کی ہے کہ ماضی میں انھوں نے انگریزی زبان کا مقاطعہ کیا تھا تو پچاس سال پیچھے رہ گئے تھے چنانچہ انھوں نے ماضی کے اس تجربے کی روشنی میں خواھی نخواھی ھندی پڑھنے اور سیکھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ویسے ان کے لئے کوئی چارہ کار بھی نہ تھا کیونکہ اتر پردیش اور بہار میں ھندی ھی واحد ذریعہ تعلیم ہے۔ اس کی وجہ سے کچھ دشواریاں بھی درپیش ھیں ۔ اب نوجوانوں میں ایک ایسا طبقہ بھی پایا جاتا ہے جو صرف ھندی جانتا ہے ۔ اترپردیش و بہار کے نوجوانوں کا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ان میں سے انٹر کے بعد جو طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں داخلہ کے لئے جاتے ھیں انھیں وھاں سخت مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ کیونکہ وھاں ذریعۂ تعلیم ابھی تک انگریزی ہے۔ جب کہ وہ نہ تو انگریزی جانتے ھیں نہ ھی اردو میں اپنا مافی الضمیر بیان کر سکتے ھیں ۔ اس مسئلہ کا عارضی حل بعض اوقات یہ تلاش کیا جاتا ہے کہ انھیں ھندی میں جوابات لکھنے کی اجازت دے دی جاتی ہے۔

بہار میں گو اردو کو علاقائی زبان تسلیم کر لیا گیا ہے لیکن یہ فیصلہ صوبہ بہار کے صرف چند علاقوں کے لئے موثر ھوگا پورے صوبے کے لئے نہیں ۔ اترپردیش میں بھی اردو کو علاقائی زبان قرار دیئے جانے کے بارے میں سرکاری اعلان تو کر دیا گیا ہے لیکن اسے عملی شکل اختیار کرنے کے لئے ابھی بہت سے مراحل سے گزرنا پڑے گا۔

بلاشبہ حکومت نے مختلف صوبوں میں اردو اکیڈیمیاں بھی قائم کردی ھیں ۔ مثلاً بہار ، اترپردیش ، بنگال ، مہاراشٹر، حیدر آباد وغیرہ میں اردو اکیڈیمیاں قائم ھیں ۔ ان کی مالی سرپرستی حکومت

کر رہی ہے۔ اور ان کے ذریعہ اردو کتابیں بھی برابر شائع ہو رہی ہیں۔

لیکن یہ اردو کے مسئلے کا حل نہیں ہے تاہم ہم اردو کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں بلکہ اس مسئلے کا ایک روشن پہلو بھی ہے وہ یہ کہ ۱۹۴۷ء کے بعد بھارت بالخصوص جنوبی ہند سے اردو زبان میں چھپنے والے اخبارات کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے علاوہ ۱۹۴۷ء کے بعد سے اردو میں جتنی کتابیں چھپی ہیں اتنی ۱۹۴۷ء سے قبل نہیں چھپی تھیں۔ اردو اخبارات و جرائد تقریباً ہر صوبے سے نکل رہے ہیں۔ بعض ڈائجسٹ ۸۰ ہزار سے ایک لاکھ تک کی تعداد میں چھپنے لگے ہیں کئی صوبوں میں ایسے تعلیمی ادارے موجود ہیں جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ پنجاب میں ۴۰ کے قریب ہائی سکولوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے جبکہ بمبئی، مہاراشٹر میں تقریباً ٦٩ انٹرکالجوں میں ذریعہ تعلیم اردو ہے۔ میسور و حیدر آباد میں بھی اردو ڈگری کالج ہیں۔ البتہ اردو کے مرکز اترپردیش میں ابھی تک کوئی اسکول ایسا نہیں، جہاں ذریعہ تعلیم اردو ہو، حالانکہ کاغذی طور پر اردو کو آٹھویں تک ذریعہ تعلیم اور لازمی مضمون قرار دے دیا گیا ہے۔ حکومت نے اب جاکر اتنا کیا ہے کہ پرائمری سکولوں میں اردو اساتذہ کی گنجائش پیدا کر دی ہے مگر جب تک معاشرتی زندگی میں اردو کو اس کا مقام نہیں ملتا ان اقدامات کا نتیجہ صفر ہی رہے گا۔

اترپردیش اور بہار میں اردو کے خلاف فضا میں انتہا پسندوں کا کردار خاصا نمایاں ہے اور آزادی کے بعد ان کے تعصب نے دوسروں کو بھی متأثر کیا بلکہ ان دنوں تو وہاں کی حکومتیں اور ہندو شہری تقریباً سب ہی اس تعصب میں مبتلا تھے کہ پاکستان اردو بولنے والوں نے بنوایا ہے اور اس میں کوئی شک بھی نہیں کہ پاکستان کی تحریک میں ان علاقوں نے بھر پور حصہ لیا۔ اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ان کا خیال تھا کہ پاکستان بنے گا تو اردو وہاں محفوظ ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جائے گی ۔ قائداعظم کے اس ارشاد نے کہ ,, پاکستان کی زبان اردو ہوگی ،، انھیں خاصا حوصلہ دیاتھا۔چنانچہ بھارتی حکومت بالخصوص جنوبی ہند کی حکومتوں اور ہندوؤں کا عام خیال یہ رہا کہ اردو پاکستان کی زبان ہے اور بھارت میں اس کے لئے کوئی جگہ نہیں مگر اب بتدریج یہ تعصب ختم ہو رہا ہے۔ اب تو خود اترپردیش کے ایک سابق وزیر اعلیٰ کا کہنا ہے ,, یہ جھگڑا اردو اور ہندی کا نہیں اردو اور ناسمجھی کا ہے۔ جس روز ناسمجھی ختم ہو جائے گی اردو اور ہندی کا جھگڑا بھی ختم ہو جائے گا ،، ۔

معروف صحافی کلدیپ نیر نے چند سال قبل جنتا پارٹی کے وزراء کے سامنے اردو کی یوں وکالت کی تھی کہ ,, اردو ، نسیم سحری جیسی لطیف اور شفقت مادری جیسی پیاری زبان کو ختم کرنے کا تصور ھی ناقابل برداشت ہے ،، ۔ آنند نرائن مُلاّ جو ھائی کورٹ کے جج رہے ھیں نے ایک مرتبہ کہا تھا ,, میں ہندو مذہب چھوڑ سکتا ھوں ، اردو زبان نہیں چھوڑ سکتا ،، ۔ انجمن ترقی اردو ہند کے موجودہ صدر مالک رام ھیں اور اراکین میں نصف سے زیادہ ہندو ھیں۔ وہ سب اردو کو ھر قسم کے دستوری ، قانونی اور لسانی حقوق دلانے میں کوشاں ھیں ۔ جنتا پارٹی کے سابق مرکزی وزیر اطلاعات اڈوانی نے پارلیمنٹ کو بتایا تھا کہ اعداد و شمار کے لحاظ سے اردو اخبارات کا نمبر پورے ہندوستان میں ہندی اور انگریزی کے بعد ہے۔ جب کہ سب سے زیادہ ھفتہ وار جرائد اردو میں چھپتے ھیں البتہ اردو کے کسی بھی روزانہ اخبار کی تعداد اشاعت پچاس ہزار سے زیادہ نہیں ھوتی ۔ جس پر ایک رکن نے کھڑے ہو کر کہا تھا کہ جالندھر سے نکلنے والے اردو ہند ,, سماچار ،، کی تعداد اشاعت پچاس ہزار سے کہیں زیادہ ہے اور خود ہندو اردو اخبارات نکال رہے ھیں ۔ اس تذکرہ کا مقصد دراصل یہ بتانا ہے کہ اب خود ہندو اردو

میں دلچسپی لینے لگے ھیں ۔ حال ھی میں بنارس یونیورسٹی میں اردو کی خصوصی کلاس کا اھتمام کیا گیا ہے جس میں ھندو طلباء کی تعداد زیادہ ہے جبکہ بی اے کی سطح پر بھی اردو پڑھنے والے ھندوؤں کی تعداد میں بتدریج اضافہ ھو رہا ہے ۔ شبلی کالج اعظم گڑھ میں اردو کے دو سیکشن ھیں اور ان میں ھندوؤں کی تعداد زیادہ ہے ۔

س : کیا اس لسانی الجھن سے دار المصنفین بھی متأثر ھوا ؟

ج : خدا کا شکر ہے کہ دار المصنفین اس لسانی الجھن سے متأثر نہیں ھوا ۔ البتہ ایک مرتبہ بھارتی حکومت کے ایک بہت بڑے عہدہ دار دار المصنفین تشریف لائے تو ھمارے کاموں کو دیکھ کر بولے کہ ,,بھارت میں اردو کا کوئی مستقبل نہیں ہے اس لئے بہتر ہے کہ آپ ھندی میں کام کریں اور اسلامی علوم و فنون کو ھندی میں منتقل کر دیں تاکہ ھندی جاننے والے بھی مستفید ھو سکیں ۔ اس پر میں نے عرض کیا تھا کہ ,, آپ اس کی فکر نہ کریں کہ اردو کا مستقبل ہے یا کہ نہیں کیونکہ جو زبان زندہ رھنے والی ھوتی ہے اسے دنیا کی کوئی قوت ختم نہیں کر سکتی ۔ البتہ کوئی حکومت مرنے والی زبان کو اپنے تمام تر وسائل کے باوجود زندہ نہیں رکھ سکتی ۔ بہرحال اس کو آپ مستقبل پر چھوڑ دیجیئے کہ اردو مرتی ہے یا زندہ رھتی ہے ۔ اگر اسے مرنا ہے تو ھمیں اس کی موت پر دکھ نہیں ھوگا اور اگر زندہ رھنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو پھر اسے کوئی مار نہیں سکتا ،، ۔ میرے اس جواب پر وہ خاموش رہ گئے ۔

س : بھارتی مسلمانوں کی مجموعی حالت کیا ہے ؟

ج : بلاشبہ بھارت میں ھندو مسلم فسادات ھوتے رھتے ھیں لیکن یہ انتہا پسندوں کے باعث ھوتے ھیں ورنہ اکثریت ان کو پسند نہیں کرتی ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کے حالات پہلے کی نسبت بہت بہتر ھیں ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ الحمد للہ ! اب ان میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خود اعتمادی پیدا ہو رہی ہے اور چھوٹی چھوٹی تجارتوں میں لگ کر انھوں نے اپنے اقتصادی حالات بہتر بنا لیئے ھیں ۔ ویسے بھی ایک بڑی تعداد تلاش معاش کے سفر میں عرب ممالک پہنچ گئی ہے۔ اس کی وجہ سے مالی معاملات بہتر ہوئے ھیں ۔ خود اعظم گڑھ میں پندرہ بیس لاکھ روپیہ ماھانہ بیرون ملک کارکنوں کے ذریعے پہنچتا ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر بھارت کے مسلمانوں کے خوشحال علاقوں کی فہرست بنائی جائے تو اعظم گڑھ ان میں ضرور شامل ہوگا ۔ ویسے بھی وھاں کے مسلمانوں میں تعلیم عام ہے پھر زراعت و تجارت میں بھی کامیاب ھیں ۔

ہندو مسلمان بلوے ضرور ہوتے ھیں مگر اجتماعی حیثیت سے مسلمانوں پر کوئی خوف و ہراس طاری نہیں ہے۔ بھارتی مسلمانوں کے مسئلے تین ھیں ۔ مسلم یونیورسٹی ، پرسنل لاء، اور اردو ، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی کو گورنمنٹ نے بہت سے حقوق لوٹا دیئے ھیں اور اس کا اقلیتی کردار تسلیم کر لیا ہے۔ اس وقت وھاں ۱۸۰۰ طلباء زیر تعلیم ھیں ان میں ہندو بھی ھیں اور مسلمان بھی ، اساتذہ میں بھی یہی صورت حال ہے ۔ یونیورسٹی کے تحفظ کے علاوہ اپنے تعلیمی مسائل کے حل کیلئے مسلمان نئے نئے سکول اور کالج کھول رہے ھیں ۔ اور یوپی میں تو مسلمانوں کا ایک ڈگری کالج بھی قائم ہو چکا ہے اور ان کے تعلیمی اداروں کے اقلیتی کردار کو مان لیا گیا ہے۔ اس لئے ان کا انتظام مسلمانوں کے ھی ھاتھ میں ہے۔ نتیجہ یہ کہ مسلمانوں میں مقابلے کی فضا پیدا ہو رہی ہے اور اب وہ مقابلے میں چھوٹی موٹی ملازمتوں پر بھی کامیاب ہونے لگے ھیں ۔ ان میں یہ احساس بتدریج فروغ پا رہا ہے کہ جب تک ان میں قابلیت و صلاحیت نہ ہوگی وہ اس معاشرے میں زندہ نہیں رہ سکتے ۔

ایک وقت تھا کہ مسلمان بالخصوص نوجوان وہاں کے ماحول سے تنگ یا مجبور ہو کر پاکستان کا رخ کرتے تھے ، مگر اب وہاں سے کوئی مسلمان نوجوان اور خاندان پاکستان آنے یا وہاں سے ترک سکونت کرنے کی خواہش نہیں کرتا۔ البتہ بعض مجبوریاں ہیں، مثلاً یہ کہ کوئی خاندان دونوں ملکوں میں بٹا ہوا ہے ایسے خاندان کے فرد بامر مجبوری ترک سکونت کرتے ہیں۔ جنوبی ہند کے مسلمانوں میں غیر معمولی خود اعتمادی پیدا ہو گئی ہے۔ وہاں ہندو مسلم کشمکش بھی زیادہ نہیں ہے۔ اگر کبھی ہندو جارحیت کا سامنا کرنا بھی پڑے تو ان میں بے انتہا قوت مزاحمت ہے اور اب یہ قوت ناسازگار حالات کے باوجود بھی اپنا اثر دکھاتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے تعلیمی ادارے اور اپنی تنظیمیں قائم کرکے اپنی اجتماعی اور مذہبی زندگی اچھی بنا لی ہے۔ بمبئی تو اسوقت اردو کا مرکز ہے اور وہاں کے مسلمان تاجروں میں زبردست خود اعتمادی پیدا ہو چکی ہے۔ مختصر یہ کہ بھارتی مسلمانوں نے اپنی تہذیب و تمدن کو ناسازگار حالات میں بھی بچانے کا عہد کر رکھا ہے۔ مجموعی حیثیت سے تمام ہندوستان کے مسلمانوں میں مذہبی جذبہ اور دین کی پابندی کا خیال روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ خصوصاً مسلمان نوجوان دین کی طرف زیادہ مائل ہو رہے ہیں۔ ویسے بھی مسلمان ملحد تو ہو سکتا ہے مشرک نہیں ، الحاد یا شرک سے بچنے کا ایک ھی ہتھیار ہے کہ دین کی پابندی کی جائے اور یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس سے ان کی قوت مزاحمت میں اضافہ ہوتا ہے۔

پرسنل لاء کے بارے میں اگرچہ سرکاری سطح پر یہ یقین دھانی کرادی گئی ہے اور اعلان کر دیا گیا ہے کہ حکومت ان میں مداخلت نہیں کرے گی اور حکومت کی طرف سے ایک مسلم پرسنل لاء بورڈ بھی قائم کر دیا گیا ہے مگر پھر بھی بعض حلقے چند ,, ترقی پسند،،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قسم کے مسلم نوجوانوں اور خواتین کو آلۂ کار بنا کر گاھے بگاھے اس مسئلے کو اٹھاتے رہتے ھیں یعنی براہ راست مداخلت کے الزام سے بچنے کیلئے ,, بالواسطہ " راستہ اختیار کرنے کی کوشش اب بھی جاری ہے مگر یقین ہے کہ یہ کوشش بھی کامیاب نہیں ھوگی ۔

س : پاکستان کے بارے میں بھارتی شہریوں کا رویہ کیا ہے ؟

ج : پاکستان کے بارے میں بھارت کی اکثریت کے انداز فکر میں ایک مثبت تبدیلی نظر آتی ہے اور وہ منفی فکر بتدریج ختم ھو رھی ہے جو چند سال قبل تک بہت نمایاں تھی ۔ اس میں شک نہیں کہ انتہا پسند آج بھی ,, پاکستان " کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہیں ھیں مگر سوچنے سمجھنے والے طبقے پاکستان سے دوستانہ اور اچھے ھمسایوں کے سے تعلقات چاھتے ھیں ۔ جبکہ ایک واضح اکثریت کا ,, انتقامی جذبہ " بنگلہ دیش کے قیام کے بعد ٹھنڈا پڑ گیا ہے کیونکہ پاکستان کو ٹکڑے کرنے کے بعد جو ملک ,, بنگلہ دیش " کے نام سے وجود میں آیا اس کے ساتھ بھی ان کے تعلقات اچھے نہیں رھے ۔ اس لئے وہ بھی اب یہ سوچنے لگے ھیں کہ کیوں نہ پاکستان کے ساتھ اچھے ھمسایوں کی طرح رھا جائے ۔ جہاں تک بھارتی مسلمانوں کا تعلق ہے تو وہ بھارتی ریاست اور قانون کے وفادار ھیں لیکن ان کا روحانی رشتہ پاکستان سے ہے نہ صرف اس لئے کہ وہ امت مسلمہ کے فرد ھیں بلکہ اس لئے بھی کہ پاکستان ان کے تخیل کا تاج محل ہے ۔

س : پاکستان میں نفاذ اسلام کا جو عمل جاری ہے اس بارے میں آپ کا تأثر کیا ہے ؟

ج : پاکستان میں نفاذ اسلام کے عمل کا کون مسلمان ہے جو خیر مقدم نہیں کریگا ، جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے ۔ پاکستان تو بھارتی مسلمانوں کے تخیل کا تاج محل ہے اور یہ جتنا اچھا ھوگا اتنا ھی

محترم ہوگا ۔ اس کے نزدیک تو پاکستان کا مطلب کیا ؟ لا الہ الا اللہ ہی ہے۔ اور اس کی راہ میں شہید ہونے والوں کا خون بہا، عورتوں اور بچوں کی آہ و بکا کا معاوضہ یہ ہے کہ اسے صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنایا جائے ۔ دنیا کے نقشے پر جس قدر بھی اسلامی ملک ہیں وہ سب قومی ریاست ہیں ۔ جبکہ پاکستان ایک نظریاتی ریاست ہے۔ اکلوتی اسلامی نظریاتی ریاست ۔ اسلام کا قلعہ ۔ قیام پاکستان سے قبل ہندوستان ایک جغرافیائی وحدت تھا ۔ اس سے پاکستان محض اس لئے جدا ہوا کہ اسے ایک نظریاتی ریاست بننا تھا اور ان تمام دعوؤں اور وعدوں کا جو اس وقت کئے گئے تھے تقاضا یہی ہے کہ پاکستان جس فکر و نظر کے تحت بنا ہے اس کا نظام اسی کے تابع ہو اور اگر ایسا نہ ہوا، یعنی یہاں نفاذ اسلام کا تجربہ کامیاب نہ ہوا تو اس سے اسلام کو تو کوئی ضعف نہیں پہنچے گا کہ وہ تو ایک دائمی حقیقت ہے لیکن مسلمانان عالم کو بحیثیت مجموعی اور اسلامیان پاکستان کو بطور خاص سخت دھچکا لگے گا ۔

دو ڈھائی سال قبل معروف عالم دین مولانا ابو الحسن ندوی پاکستان تشریف لائے تو انہوں نے اسلام آباد ہوٹل کے ایک اجتماع میں فرمایا تھا اور بڑی صاف گوئی سے کہا تھا کہ ,, مجھے اکثر دوسرے اسلامی ممالک کا دورہ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ وہاں سے ملت اسلامیہ کو قیادت ملنے کی امید نہیں ہے کیونکہ ان میں جان باقی نہیں رہی ہے اگر کچھ جان ہے تو پاکستان میں ہے۔ خدا نخواستہ یہ ضائع ہو گیا تو پورے عالم اسلام کو جو نقصان پہنچے گا اس کی تلافی دو سو برس تک نہیں ہو سکے گی " ۔ اسی دورے میں انہوں نے ایک نجی محفل میں یہ بھی کہا تھا ,, اللہ تعالی نے پاکستان کی شکل میں یہاں کے مسلمانوں کو بہت بڑی نعمت عطا کی ہے ، جس کا انہیں ہر لمحہ شکر ادا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا چاھیئے ۔ آپ لوگ میرا یہ پیغام ہر گھر میں پہنچا دیں » میں اپنی پوری بصیرت اور دانش کے ساتھ مولانا کے اس تأثر سے متفق ہوں۔ اهل پاکستان اگر اسلام اور اپنے نظریہ سے محبت رکھتے هیں تو انهیں اس وعدہ اور دعوی کا پاس کرنا هوگا جو انهوں نے تحریک آزادی کے دوران کیا تھا ۔ یاد رکھیئے کہ پاکستان کے اسلامی ریاست بننے کا فائدہ صرف پاکستان هی کو نہیں بلکہ پوری دنیائے اسلام بالخصوص اقلیتی مسلمانوں کو پہنچے گا کہ ایک حقیقی اسلامی ریاست اپنے اچھے اور عمدہ کردار اور نمونے کے ذریعہ ان کے لئے باعث تقویت هوگی ۔

میں یہاں یہ کہنا چاهوں گا کہ اگر کوئی یہ توقع رکھتا ہے کہ خلافت راشدہ کا زمانہ پلٹ آئے گا تو یہ ممکن نہیں ، اور یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی اسلامی ملک کے سو فیصد مسلمان پکے اور سچے مسلمان بن جائیں لیکن ملک کی اکثریت اچھے اور سچے مسلمانوں کی هو تو یہ اسلامی ریاست کہلانے کا پورا مستحق هوگا ۔

س : مولانا صاحب ! آج کل یہاں اسلامی نظام حکومت اور مغربی جمہوریت میں ایک کشمکش جاری ہے ، ایک طرف همارے بعض سیاسی قائدین پارلیمانی جمهوری نظام کے علمبردار هیں اور مغربی جمهوری تصورات کو عین اسلام قرار دیتے هیں تو دوسری طرف بعض حلقے مغربی جمہوریت کے خلاف هیں اور اسے اسلامی تعلیمات کے مطابق تسلیم کرنے سے انکاری هیں ؟ ایک مورخ اور غیر جانبدار اسکالر کی حیثیت سے آپ کا کیا خیال ہے ؟ ۔

ج : قرآن و حدیث میں اسلامی نظام حکومت کا تعین نہیں ہے اور یہ محض ایک خیال یا تأثر نہیں بلکہ قرآن و حدیث کے برسوں پر پھیلے ہوئے مطالعہ کا نچوڑ ہے۔ قرآن مجید میں کوئی ایک آیت ایسی نہیں ہے جس میں اسلامی نظام حکومت کی کسی واضح شکل کا

تعین کیا گیا ہو۔ نہ ھی سرور کائنات نے کوئی منشور، کوئی خاکہ یا کوئی ارشاد ایسا چھوڑا ہے جس سے اس کی شکل کا تعین ہو سکے۔ اور کوئی بھی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ خداوند تعالی اور سرور کائنات سے اس کی ضرورت و اھمیت مخفی تھی۔ اسلام ایک ھمہ گیر دین ہے۔ اس میں نظام حکومت کی شکل کا واضح تعین نہیں کیا گیا تو یہ بھی اللہ کی مصلحتوں میں سے ایک ہے اور واقعہ بھی یہ ہے کہ کوئی ایک لگا بندھا نظام حکومت تمام ممالک کیلئے موزوں و مناسب نہیں ہو سکتا۔ کسی بھی ملک کے نظام حکومت کا تعین، اس ملک کے جغرافیائی حالات عوام کے مزاج اور تاریخی و معاشرتی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے مطابق کیا جاتا ہے اور تمام سیاسی نظریہ ساز اس پر متفق ھیں، خود مغرب میں کہ جسے ھمارا مغلوب ذھن قبلہ سمجھتا ہے، کہیں بادشاھت، کہیں آئینی بادشاھت، کہیں آمریت، کہیں پارلیمانی یا صدارتی جمہوریت اور کہیں سوشلزم ہے۔ مختصر یہ کہ قرآن و حدیث میں نظام حکومت کا تعین نہیں کیا گیا اور اسے ھر دور اور ھر ملک کے لوگوں کی پسند پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ البتہ قرآن مجید نے نظم حکومت کے سلسلے میں رھنما اصولوں کا تعین واضح الفاظ میں کر دیا ہے اور یہ اصول دنیا کے بہترین اصول ھیں۔ قرآن مجید نے ملت اسلامیہ کو بہترین امت قرار دیتے ہوئے اسے تمام امور میں توازن و اعتدال کی راہ اپنانے کا حکم دیا ہے۔ وہ ایسی فلاحی مملکت کا داعی ہے جس کا مقتدر اعلیٰ خدا ہے اور سربراہ مملکت اور اس کے اعیان و ارکان متقی، پرھیزگار، فہیم، مدبر اور عاقل لوگ ھوتے ھیں اور اس کے بندوں پر احکم الحاکمین کے قوانین، اوامر و نواھی نافذ کرتے ھیں مختصر یہ کہ اسلامی ریاست میں اقتدار متقی اور پرھیز گار لوگوں کے پاس اللہ تعالی کی امانت ھوتا ہے اور وہ قرآن و سنت کے احکامات نافذ کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے پابند ہوتے ہیں ۔ قرآن مجید میں ان متقی لوگوں کی نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ ,, وہ اپنے رب کے حکم کے پابند ہوتے ہیں اور نماز باقاعدگی سے ادا کرتے ہیں اور اپنے تمام امور باہمی مشاورت سے طے کرتے ہیں ،، ۔

اسلام میں اقتدار ذاتی مقاصد اور اغراض کا ذریعہ نہیں ہوتا بلکہ اس کی غایت خدا کی حاکمیت اور دین کا قیام، استحصال و جبر کا خاتمہ اور عدل و انصاف اور امن و امان کا دور دورہ ہے۔ اس کے سربراہ کی مجلس مشاورت کی تشکیل کس طرح ہو ؟ قرآن مجید میں اس کا کوئی واضح طریقہ نہیں ہے بلکہ اسے عوام کی رائے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ اگر مجلس مشاورت ، اکثریت، رائے سے تشکیل پائے تو اس امر کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی کہ اس میں قرآن کے مطلوبہ لوگ ہی منتخب ہو کر آئیں گے کیونکہ ایسا کم ہی ہوا ہے کہ غلط لوگوں نے اچھے لوگوں کو پسند کیا ہو ۔ اور اگر مجلس مشاورت صحیح ، نیک اور شریف لوگوں پر مشتمل نہ ہو تو پھر یقیناً سربراہ حکومت کے انتخاب ، یا چناؤ میں بھی غلطی ہونے کا امکان ہے۔ قرآن کی مطلوبہ مجلس مشاورت کے ارکان کی اہلیت کیلئے ضروری ہے کہ وہ نیک لوگ ہوں ، خدا کی عبادت کرتے ہوں ، مکار اور دھوکے باز نہ ہوں ، چوروں ، ڈاکوؤں اور زنا کاروں کی صحبت سے دور بھاگتے ہوں ، وہ لوگوں سے اور لوگ ان سے محبت کرتے ہوں ، یہ ہے مختصر خاکہ اسلامی طرز حکومت کا ۔

س : تو گویا آپ کے نزدیک مروجہ جمہوریت یا جمہوری حکومت کی تشکیل کا سارا عمل غیر اسلامی ہے ؟

ج : یہی سمجھ لیجیئے ، اس میں شک نہیں کہ اسلامی ریاست کا مزاج جمہوری اور فلاحی ہوتا ہے لیکن یہ جس طرح قائم ہوتی اور تشکیل پاتی ہے اس کے پیش نظر اس طرز حکومت کو

تھیوکریسی ، تھیو ڈیموکریسی یا عوامی آمریت ، بادشاھت،فاشزم یا سوشلزم میں سے کوئی بھی نام نہیں دیا جا سکتا ۔ بلکہ یہ جمہوریت اور بادشاھت کے درمیان کوئی طرز حکومت ہے جس میں بادشاھت ، جمہوریت ، آمریت اور سوشلزم کی تمام خوبیاں تو موجود ھوتی ھیں لیکن ان کی برائیوں سے وہ پاک ھوتا ہے گویا یہ ایک مثالی طرز و نظام حکومت ہے ۔ یہاں میں یہ بھی عرض کرونگا کہ بادشاھت قرآن وحدیث کے نزدیک ممنوعہ یا ناپسندیدہ شے نہیں ہے

قرآن مجید میں خدا نے بعض مقامات پر اپنے لئے بنی نوع انسان کا بادشاہ یا کائنات کا بادشاہ ھونے کے الفاظ استعمال کئے ھیں ۔ اسی طرح طالوت ، شاہ اسرائیل کا پسندیدہ لوگوں میں ذکر کیا ہے ۔ جبکہ یہودی بادشاھت کے بانی حضرت داؤد علیہ السلام اللہ کے نبی بھی تھے ان کے جانشین ان کے بیٹے حضرت سلیمان علیہ السلام ھوئے ۔ اور ان کا ذکر قرآن نے پوری تفصیل سے کیا ہے ۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کو شاہ مصر کہا گیا ہے ۔ گویا قرآن اصولی طور پر بادشاھت یا خاندانی بادشاھت سے الرجک نہیں ہے بلکہ اللہ تعالی نے تو نبوت میں بھی وراثت کا طریقہ کار اختیار کیا ہے ۔ مثلاً حضرت ابراھیمؑ کے بیٹے حضرت اسحاقؑ و حضرت اسماعیلؑ بھی نبی تھے حضرت یعقوبؑ،حضرت اسحاقؑ کے صاحبزادے تھے ۔ حضرت ذکریا کے بعد ان کے بیٹے حضرت یحییٰؑ کو نبوت ملی ۔ اس بیان سے میرا مدعا یہ ہے کہ جو لوگ بادشاھت کو ,, اسلام ،، کے حوالے سے رد کرتے ھیں انھیں اس پہلو پر بھی غور کرنا چاھیئے ۔

ھاں تو بات جمہوریت کی ھو رھی تھی اور جیسا کہ میں نے کہا ہے اسلامی ریاست اپنی روح کے لحاظ سے یقیناً جمہوری ہے لیکن اس میں مروجہ جمہوریت کی کوئی جگہ نہیں ہے ۔ اسلامی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ریاست کے بارے میں یہ بات طے شدہ ہے اور دین کے مسلمات میں سے ہے کہ اس کا حکمران خواہ صدر ہو یا بادشاہ،قرآن و سنت کے نفاذ کا پابند ہوتا ہے اور اس میں مقتدر اعلیٰ اور قوت و طاقت کا سرچشمہ خداوند تعالی کی ذات ہے۔ جبکہ مروجہ جمہوریت کی تعریف یہ کی جاتی ہے کہ ,, عوام کی حاکمیت عوام کے ذریعہ سے ،، ۔ یا یوں کہہ لیں کہ مروجہ جمہوریت میں طاقت و اقتدار کا سرچشمہ عوام کو قرار دیا جاتا ہے اور عوام کے نمائندوں کو قانون سازی کا پورا اختیار ہوتا ہے۔ مگر اسلامی ریاست میں سربراہ مملکت یا اس کی مجلس مشاورت یا پارلیمنٹ قرآن و سنت کی بالادستی تسلیم کرتی اور اس کے اوامر و نواھی کو نافذ کرنے کی پابند ہوتی ہے۔ وہ اپنی منشا یا پسند کا واضح اکثریت بلکہ اتفاق رائے سے بھی کوئی ایسا قانون نہیں بنا سکتی جو قرآن و سنت کی ھدایت کے منافی ہو پھر اسلام میں کسی مقررہ مدت کیلئے سربراہ مملکت کے انتخاب کا بھی کوئی تصور نہیں ، وہ لوگ جو خلافت راشدہ سے مروجہ جمہوریت کے حق میں استنباط کرتے ہیں وہ یہ کیوں بھول جاتے ہیں کہ وہاں تو کسی ایک بھی خلیفہ کا انتخاب مروجہ طریقہ انتخاب کے تحت نہیں ہوا ۔ حضرت ابوبکرؓ ثقیفہ بنی ساعدہ میں منتخب ہوئے اور امت نے انہیں اپنا سربراہ تسلیم کر لیا ۔ حضرت عمرؓ کا انتخاب نہیں ہوا بلکہ وہ نامزدگی تھی ۔ حضرت عثمانؓ کو امت کے چھ بہترین دماغوں نے باھمی صلاح و مشورے سے خلیفہ چنا اور حضرت علیؓ کا انتخاب انتہائی انتشار و افتراق کے عالم میں ہوا ۔ اور پھر یہ بھی غور کیجیئے کہ کیا ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی اکابر امت نے کبھی یہ سوچا کہ چلیے چار یا پانچ سال پورے ہو گئے اب اس کی جگہ دوسرے کو آنا چاھیئے ۔ یہی نہیں بلکہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نفاذ شریعت کیلئے آھن ہو گئے ۔ حضرت عمرؓ درہ لیکر پھرتے

رهے کسی نے یہ نہ کہا کہ ہم ان پر عدم اعتماد کرتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ سب اسلامی ریاست کی غایت سے آشنا تھے اور جانتے تھے کہ اسلامی ریاست کا منتہائے مقصود ہی قرآن و سنت کا نفاذ ہے اور خلیفہ وقت انہیں پوری شدت سے نافذ کرنے کا پابند ہے خواہ اس کے لئے اسے کتنی بھی سختی کیوں نہ کرنا پڑے ۔

مختصر یہ کہ اسلامی ریاست میں مغربی جمہوریت کی کوئی جگہ نہیں اور جو لوگ اسلام میں اس کا جواز پیدا کر رہے ہیں وہ دراصل اسلامی تعلیمات سے ناآشنا ہیں یا کہہ لیجیئے کہ وہ مغرب کے زیر اثر ہیں ، پارلیمنٹ کا تصور انہوں نے برطانیہ سے ورثہ میں پایا ہے اور اس ورثہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے ۔ مقصد یہ ہے کہ ہم لوگ اسلامی ذہن و فکر سے عاری نہیں تو الرجک ضرور ہیں ، مغرب کا انداز فکر اور سوچ ہماری روز مرہ زندگی پر اس بری طرح چھایا ہوا ہے کہ اسے بدلنا نہیں چاہتے ، اس کی ایک چھوٹی سی مثال تو یہ ہے کہ دوران گفتگو شاید ہی ہمارا کوئی جملہ ایسا ہو جس میں ہم انگریزی کا سہارا نہ لیں، دوسری مثال یہ ہے کہ آپ اپنے گھر میں دیکھ لیجیئے وہاں کوئی نہ کوئی پنکھا ضرور ہوگا مگر اسے آپ پنکھا نہیں کہیں گے بلکہ ,, فین ،، کہنے میں خوشی محسوس کریں گے مثلاً پاک فین ، پنجاب فین ، رائل فین وغیرہ ۔

ویسے جو لوگ پارلیمانی جمہوریت کے مداح ہیں انہیں یہ فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ برطانوی پارلیمانی جمہوریت کی تاریخ پونے آٹھ سو سال پرانی ہے۔ میگنا کارٹا (۱۲۱۵ء) سے سات سو سال بعد ۱۹۱۱ء میں لارڈ رسکی نے اسے کامیاب قرار دیا تھا مگر اس وقت بھی برطانوی خواتین کو حق رائے دہی کا حق حاصل نہیں ہوا تھا اور یہ حق انہیں ۲۸ ۔ ۱۹۲۹ء میں ملا ۔ پھر خود یورپ میں مختلف النوع نظام حکومت ہیں کہیں پارلیمانی جمہوریت ہے تو کہیں صدارتی ، کہیں بادشاہ ہے تو کہیں آمر مطلق ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جہاں تک مغربی جمہوریت اور پاکستان کا تعلق ہے تو اسے بھارت سے سبق لینا چاہیے ۔ وہاں جب تک صوبوں اور مرکز میں کانگریس رہی یہ طرز جمہوریت کامیاب نظر آیا مگر اب جو صورت حال ہے اور مرکز اور صوبوں میں جو کشمکش ہے وہ سب کے سامنے اور لمحہ فکریہ ہے واقعہ یہ ہے کہ بھارت کا دانشور طبقہ روز اول ھی سے اس پارلیمانی جمہوریت کا مخالف رہا ہے۔ جے پرکاش نرائن نے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ بھارت کے لئے پارٹی سسٹم ناموزوں ہے اگر بھارت نے اسے اپنایا تو بھارت تباہ ہو جائے گا ۔ مگر وہ اس کا کوئی متبادل نہ بتا سکے تھے اور کہتے تھے کہ ,, یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سا نظام ہونا چاہیئے" ۔ بھارت میں اگر ۲۲ اسمبلیاں ھیں تو پاکستان میں بھی یہی صورت ہے یہاں ۲۲ نہ سہی ۵ سہی ، اور پانچوں کی سوچ مختلف ہونا، بعض معاملات میں فطری بات ہے۔ پنڈت جے پرکاش کی طرح صدر راجندر پرشاد نے بھی مغربی جمہوریت کے بارے میں یہی کہا تھا کہ ,, بالغ رائے دھی کا طریقہ بھارت کیلئے تباہ کن ہوگا " ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ,, جواھر لال نہرو اسے اس لئے عزیز رکھتے ھیں کہ وہ ان پڑھ لوگوں میں مقبول ھیں اگر وہ یہ طریقہ کار تبدیل کر دیں تو انہیں ووٹ کون دے گا " ۔

اسلامی ممالک پر نظر ڈالئے ، ترکی ھو یا پاکستان یا کوئی اور ملک جہاں کہیں بھی مغربی جمہوریت نافذ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں کامیاب نہیں ھو پاتی ۔ کیونکہ مسلمانوں کی اکثریت کے ذھنوں میں یہ بات جاگزیں ہے کہ یہ نظام قرآن و سنت کے منافی ہے اور وہ مقتدر اعلیٰ خداوند کریم کے سوا کسی کو نہیں سمجھتے وہ اپنی حکومتوں کو غیر مرئی انداز میں یہ احساس دلا رہے ھیں کہ قوت و قانون کا سرچشمہ وھی ذات باری تعالی ہے اور یہ میرا نظریہ یا خیال نہیں بلکہ اسلامی تاریخ کے گہرے مطالعہ کا حاصل ہے ۔

ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اجنبی نظریات سے کچھ ایسے متأثر ہوئے ہیں کہ خلافت راشدہ کے بعد اسلامی سلطنتوں کو اسلامی ماننے کے لئے ہی تیار نہیں ہیں ۔ حالانکہ وہ سب اسلامی تھیں البتہ ان کا طرز حکومت خلفاء راشدین سے مختلف ہو گیا اور یہ تصور ہر دور میں برقرار رہا کہ سربراہ منتخب ہو ۔ چنانچہ بیعت کا طریقہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ اس وقت تک امت کو اطمینان ہوتا نہ ہی سربراہ (خلیفہ یا سلطان) مطمئن ہوتا جب تک حکومت کے اعلی ترین اکابر ، عدلیہ ، فوجی و سول عہدیدار ان سے بیعت نہ کرتے کہ ان کے مطابق یہی اصحاب الرائے تھے ۔ ویسے تاریخ اس امر کی بھی گواہی دیتی ہے کہ جب بھی کسی حکمران نے کسی ایسے بیٹے یا عزیز کو اپنا جانشین بنایا جو نا اہل تھا تو اصحاب الرائے نے اسے تسلیم نہیں کیا اور امت نے بغاوت کی ۔ خلافت راشدہ کے بعد کے احوال (بنو امیہ اور بنو عباسیہ) پر نظر ڈالیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ بنو امیہ کے ۱۴ میں سے صرف ۴ نے اپنے بیٹوں کو جانشین نامزد کیا ۔ اور بنو عباس کے ابتدائی ۲۴ حکمرانوں میں سے صرف ٦ کے بیٹے جانشین بن سکے ۔ قطع نظر اس کے کہ بعض حکمرانوں کے ذاتی افعال و کردار کسی طور پر بھی اسلام کے معیار پر پورے نہیں اترتے انھوں نے اجتماعی زندگی میں کبھی بھی قرآن و سنت کے احکام کو اصولی حیثیت سے بالائے طاق رکھنے کی جرأت نہ کی اور شیخ الاسلام صدر الصدور ، قاضی و مفتی کے عہدے اس بات کے غماز ہیں کہ انھوں نے اسلام ہی کو ریاستی زندگی کا محور بنائے رکھا ۔

س : مولانا محترم ! بعض حلقوں کی طرف سے یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ اسلامی قوانین اور رومن قوانین میں کوئی بڑا فرق نہیں اور مروجہ قوانین کسی طور بھی اسلام کے منافی نہیں ہیں ؟

ج : یہ ایک گمراہ کن خیال یا نظریہ ہے دو تین سال قبل کی بات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے کہ بھارت میں پندرھویں صدی ھجری کی تقریبات کے سلسلے میں ,, اسلامی فقہ ،، پر بھی سیمینار ھوا ۔ اس میں کئی مسلم وکلاء اور اھل قلم نے تو یہ تأثر دیا کہ اسلامی قوانین ، رومن قوانین پر مبنی ھیں ۔ لیکن اس اجلاس میں ایک غیر مسلم جسٹس (ریٹائرڈ) سوامی آئر نے جو تقریر کی وہ نہایت مختصر مگر جامع اور سب کے منہ پر ایک طمانچہ تھی ۔ انھوں نے کہا ۔

,, اسلامی قوانین ھی وہ اصولی قوانین ھیں جنھیں پورے اعتماد کے ساتھ بین الاقوامی قوانین بنایا جا سکتا ہے۔ دراصل وہ لوگ جو اس قسم کے مغالطے پیدا کرتے ھیں وہ اسلامی ذھن و فکر سے عاری ھیں اور اپنی ذات میں کوئی تبدیلی نہیں چاھتے ،، ۔

س : مگر بعض امور ایسے ھیں جن کے بارے میں قرآن و حدیث میں کوئی واضح رھنمائی نہیں ہے ۔

ج : یہ بھی محض کج فہمی یا شکست خوردگی ہے اور اسے پھیلانے میں سیاست دان آگے آگے ھیں ۔ ایسے مسائل میں ھمیں اجماع و قیاس کے مسلمہ اصولوں سے استفادہ کرنا چاھیئے ۔ کیا آپ کو حضرت معاذ کی وہ بات یاد نہیں کہ جو انھوں نے سرور کائنات کی طرف سے یمن کا والی بنا کر بھیجے جانے کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک استفسار میں کہی تھی کہ ,, فیصلہ طلب امور مملکت میں پہلے قرآن مجید میں رھنمائی تلاش کرونگا وھاں سے ناکامی کے بعد حدیث سے مدد چاھوں گا اور اگر قرآن و سنت میں کوئی واضح حکم نہ ملا تو پھر قرآن و حدیث کی روشنی میں اپنی عقل کو بروئے کار لاتے ھوئے اجتہاد کروں گا ،، ۔

آج بھی ان مسائل کے بارے میں اسی طرح اجتہاد کی ضرورت ہے مشکل یہ ہے کہ آج اسلامی فقہ کی تدوین و ترتیب سیاست دانوں کے ھاتھ میں آ گئی ہے جو قوانین اپنی سیاست کے مطابق بنانا چاھتے

ھیں ۔ نیت نیک ھو اور عزم سچا ھو تو اس قسم کی مبینہ مشکلات کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جو ملک بھی اسلامی قوانین نافذ کرنا چاھتا ہے وہ علماء کرام کا ایک اجتماع طلب کرے اور تمام امور و مسائل ان کے سامنے رکھ کر ان سے رائے طلب کرے ۔ اور پھر فتاویٰ عالمگیری کی طرح ایک مکمل مجموعہ قوانین مرتب کرکے عدالتوں کو ان کی رھنمائی میں کام کرنے کا حکم جاری کر دیا جائے اور اگر پاکستان یہ کام کر سکتا ہے یا کر لے تو یہ پورے عالم اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ یاد رکھئے کہ اسلام کے نفاذ کیلئے حضرت عمرؓ کے درے سے فائدہ اٹھانے کی ضرورت ہے۔ اسلام صرف وھی حکمران نافذ کر سکتا ہے جو تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھ کر صرف اللہ کی خوشنودی کا جویا ھو اور جسے انتخاب لڑنا یا دنیا رکھنا ھو اس سے نفاذ اسلام کی توقع عبث ہوگی ۔

●●●

© rasailojaraid.com